اردو لسانیات میں پروفیسر خلیل صدیقی کا اختصاص

Professor Khalil Siddiqui's specialization in Urdu linguistics

عابد حسین [i] ثقلین احمد خاں (ثقلین سرفراز) [ii]

Abstract:

The field of linguistics in Urdu is not very old, so the number of linguistics experts is also countable on fingers, and Professor Khalil Siddiqui's name is prominent among them. He started writing on this difficult subject in the sixth and seventh decades of the 20th century, when there was a scarcity of material on linguistics in Urdu. He not only explained linguistics in an easy-to-understand way but also played a significant role in its understanding and promotion. His valuable work spans over three decades, including five published books and numerous articles. This article specifically discusses his specialized contributions to the field of Urdu linguistics.

Keywords: *Khalil Siddiqui, Linguistics, Urdu, Quetta, Balochista, Multan, Zaban Shanasi.*

اردو میں لسانیات کا مضمون زیادہ پرانا نہیں ، اس لیے ماہرین لسانیات کی تعداد بھی انگلیوں پہ گنے جتنی ہی ہے اور ان میں پروفیسر خلیل صدیقی کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کی چھٹی ، ساتویں دہائی میں ایسے وقت میں اس مشکل موضوع پہ لکھنا شروع کیا جب اردو میں اس پرمواد خال خال ہی دستیاب تھا۔ انھوں نے نہ صرف لسانیات کی آسان فہم تشریح کی بل کہ اس کی تفہیم و ترویج میں بھی کماحقہ کردار ادا کیا۔ ان کا یہ وقیع کام تین دہائیوں پر محیط ہے۔ جس میں پانچ شائع شدہ کتب اور درجنوں مقالات شامل ہیں۔ زیرنظر مقالے میں اردو لسانیات کے میدان میں ان کے انہی اختصاصی پہلوؤں کو بطورِ خاص زیربحث لایا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: خلیل صدیقی ، لسانیات ، اردو ، کوئٹہ ، بلوچستان ، ملتان ، زبان شناسی۔

ناصرف بلوچستان اور پاکستان بل کہ ایشیا سمیت جہاں جہاں اردو کی ادبی دنیا میں اگر ماہرینِ لسانیات کے چند نام لیے جائیں تو پروفیسر خلیل صدیقی کا نام ان میں نمایاں ترین ہو گا۔ اردو پہ مہارت کے ساتھ ساتھ زبانوں کے علم پر انھیں ایک خاص مہارت حاصل تھی۔ یہ بلوچستان کی سرزمین کی خوش بختی ہے کہ اسے اس نابغہ روزگار کی قربت حاصل رہی، جس نے مٹی کا قرض خوب اتارا۔

خلیل صدیقی کا خاندان شمالی ہندوستان کے علاقہ جبل پور سے کراچی اور پھر وہاں سے کوئٹہ منتقل ہوا۔ ان کا سوانحی خاکہ لکھنے والی سیما صدیقی کے مطابق والدین نے ان کا نام عبدالخلیل رکھا لیکن سکول میں ایک استاد صاحب نے اس نام کو احمد خلیل میں بدل دیا اور انھوں نے اس نام کو اختیار کر لیا۔ البتہ اسناد اور دستاویزات میں عبدالخلیل صدیقی درج ہوتا آیا ہے۔[1]

سرکاری اسناد میں ان کی تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۲۲ء درج تھی، لیکن ڈاکٹر انوار احمد کے نام ایک

[i] اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبہ اردو ، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج ، سریاب روڈ ، کوئٹہ (Corresponding Author)
[ii] لیکچرر ، شعبہ اردو ، اسلامیہ یونی ورسٹی ، بہاول پور۔

خط میں انھوں نے اپنی تاریخِ پیدائش سے متعلق جو اندازہ لگایا اس کے مطابق یہ تاریخ ۴/اگست ۱۹۲۱ء بنتی ہے۔[۲]

دس بہن بھائیوں میں ان کا نمبر پانچواں تھا۔ سب سے بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی بچپن میں ہی انتقال کر گئے۔ ایک بڑے بھائی جو عمر میں خلیل صاحب سے دو ڈھائی سال بڑے تھے، ان کے ساتھ مل کر انھوں نے پڑھائی بھی کی اور لڑائی بھی۔ گھر میں یہ بھائی ان کے بچپن کے ساتھی تھے۔

تعلیم اور ملازمت

ابتدائی تعلیم جبل پور سے ہی حاصل کی۔ گریجویشن تک وہیں زیر تعلیم رہے۔ یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو خلیل صدیقی بھارت سے پاکستان کے شہر کراچی پہنچے۔ ان کے بڑے بھائی پہلے ہی کراچی پہنچ چکے تھے۔ قائداعظم کی درخواست پر بھارت سے بے شمار گورنمنٹ ملازم اپنی ملازمتیں چھوڑ کر اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ پاکستان آ گئے۔ لیکن خلیل صدیقی جبل پور ہی میں رہے۔ ہتھ کارنی سٹی جبل پور میں دیوالی اور دسہرے کی اکیس چھٹیاں ہوئیں تو خلیل صدیقی اپنے بہن بھائیوں سے ملنے کراچی آئے۔ یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کی سب سے چھوٹی بہن بیمار ہیں جن کا بعد میں انتقال ہو گیا۔ جبل پور سے روانہ ہوئے تو شہر کے حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ خلیل صدیقی نے احتیاطاً اپنی اسناد ساتھ لے لی تھیں۔ اس دوران میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات اتنے خراب ہوئے کہ دونوں ملکوں کے درمیان رابطے کی صورت نہ رہی اور خلیل صدیقی اپنی ملازمت پر واپس نہ جاسکے اور پاکستان میں رہ گئے۔[۳]

خلیل صدیقی کے بھائی جلیل صدیقی بتاتے ہیں کہ "پاکستان بننے کے فوراً بعد جب بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کراچی میں اردو کالج کی بنیاد رکھی تو اس کے اولین اساتذہ میں خلیل میاں، پروفیسر غنی نیازی اور پروفیسر عبدالسلام وغیرہ شامل تھے۔ خلیل میاں ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں لیکچرار مقرر ہو کر کوئٹہ چلے گئے۔ بعد میں پرنسپل اور پھر ڈائریکٹر ایجوکیشن بلوچستان رہ کر ریٹائر ہوئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔"[۴]

خلیل صدیقی نے بلوچستان کی مٹی کو نا صرف اپنا لیا بل کہ اس کا حقِ نمک بھرپور طور پر ادا کیا۔ انھوں نے تمام عمر اس خطے کے کونے کونے میں جا کر خدمت کی اور تعلیم کا نور پھیلاتے رہے۔ حالاں کہ ان کے پاس ایک روشن مستقبل کے کئی راستے موجود تھے لیکن انھوں نے نہ صرف مدرسی کے پیشے کو فوقیت دی

بل کہ ایک ایسے خطے میں رہ کر یہ کام کرنا پسند کیا، جہاں اس کی شدید اور حقیقی ضرورت بھی تھی، اور ایسا انھوں نے اپنی جبلی خواہش کے تحت کیا۔ ان کے بڑے بھائی کے بہ قول ''خلیل میاں جب تعلیم مکمل کر چکے تو ان کے تعلیمی کیریئر کو دیکھتے ہوئے گھر والوں نے چاہا کہ وہ آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری کر کے امتحان میں بیٹھیں مگر انھوں نے انکار کر دیا اور انھوں نے کہا کہ تعلیم کا شعبہ ہی ان کے لیے مقدم ہے اور ان کے لیے وہی سب کچھ ہے۔ چناں چہ گھر والوں نے خاموش ہو کر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔''

خلیل صدیقی ہندوستان سے کراچی آنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں کافی عرصہ پریشانی کا شکار رہے۔ اردو کالج کراچی میں عارضی ملازمت نے انھیں کچھ سکون پہنچایا لیکن ان کی ملازمت کے باضابطہ سلسلے کا آغاز ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے ہوا۔ جہاں انھوں نے دل لگا کر کام کرنا شروع کیا۔

خلیل صدیقی کو ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں تبدیل ہو کر جانا پڑا۔ ۱۹۵۵ء میں کلاس ون جونیئر اسکیل میں ان کی ترقی ہوئی۔ اس کے ساتھ بحیثیت پرنسپل تقرر کی پیش کش ہوئی جو انھوں نے رد کر دی، لیکن ستمبر ۱۹۶۳ء میں بحیثیت پرنسپل گورنمنٹ کالج مستونگ میں ان کا تقرر ہوا۔ اس دوران وہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں اردو کی کلاسیں شروع کر چکے تھے۔ لہٰذا شام کو گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں ایم اے کی کلاسیں لینے کے لیے مستونگ سے کوئٹہ آجاتے۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں خلیل صدیقی کا تبادلہ مستونگ سے فورٹ سنڈیمن (ژوب) ہو گیا۔ اس دوران میں بھی ہفتے میں دو بار کوئٹہ آکر ایم اے کی کلاسیں لیتے رہے۔

دسمبر ۱۹۶۶ء میں کلاس ون سینئر اسکیل میں ترقی ہوئی اور گورنمنٹ کالج ملتان تبادلہ ہو گیا۔ یہاں صدرِ شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں کوئٹہ کے گورنمنٹ کالج واپس بلا لیا گیا اور وہاں پرنسپل بنا دیے گئے۔ ۱۹۷۲ء میں ڈائریکٹر ایجوکیشن ہو گئے۔ ۱۹۷۴ء میں ایک سال کے لیے چیئرمین بورڈ کا چارج بھی انھی کے سپرد کر دیا گیا اور وہ دوہرے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

خلیل صدیقی ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۰ء تک ڈیپوٹیشن پر بلوچستان بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کے چیئرمین رہے اور بہ حیثیت ڈائریکٹر ایجوکیشن بلوچستان ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ سے چند ماہ پہلے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے کوئٹہ کے ریجنل آفس کے اعزازی ڈائریکٹر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مشاہرہ پر ڈائریکٹر رہے۔

خلیل صدیقی بلوچستان یونی ورسٹی میں ڈائریکٹر پاکستان اسٹڈیز رہے۔ اس شعبے سے وابستگی اور علیحدگی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ”غالباً ۱۹۸۰ء میں بلوچستان یونی ورسٹی نے ازخود ڈائریکٹر پاکستان اسٹڈیز مقرر کر دیا، تقریباً ساڑھے تین سال بعد اس سے بھی نجات حاصل کر لی۔“

بعدازاں خلیل صدیقی تقریباً ہر سال شعبہ اردو بہاءُالدین زکریا یونی ورسٹی ملتان تشریف لاتے اور یہاں طلبہ و طالبات، اساتذہ اور تشنگانِ علم و فن ان سے استفادہ کرتے تھے۔ فیض کا یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔

شخصیت

خلیل صدیقی کو نام و نمود کی خواہش نہ تھی۔ پائے کے شاعر ہونے کے باوجود شاعروں میں اپنا کلام بہت سناتے۔ صرف نوجوانی میں مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ نوجوانی کی رومانوی شاعری پھاڑ پھاڑ کر پھینکتے رہتے کہ یہ دورِ جہالت کی نشانی ہے۔[۵]

عام زندگی میں بہت سادگی پسند تھے۔ انھیں گھر کے سامانِ آرائش سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ گزارے کے لیے چنے پانی اور جھونپڑی کافی ہوتی ہے۔ ان کے ہر کام میں انتہائی سلیقہ اور نفاست تھی۔ اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بڑے سنبھال کر رکھتے۔ قمیص کا اگر ایک بٹن بھی ٹوٹ جاتا تو سنبھال کر رکھتے اور کوشش ہوتی کہ فوراً ٹانک دیا جائے۔ شرم و لحاظ اس قدر تھا کہ بچوں نے کبھی انھیں بغیر قمیص کے صرف بنیان میں نہیں دیکھا۔ سوائے ایک دن کے جس دن وہ ریٹائر ہوئے۔ خوشی کا یہ عالم تھا کہ قمیص اتار کر فرش پر لیٹ گئے اور کہا، ”آج میں غلامی سے آزاد ہو گیا۔“ بیٹوں کے کمرے میں کبھی نہ جاتے۔

کچھ بشری کمزوریاں بھی تھیں۔ ضدی بہت تھے۔ اپنی بات کو حرفِ آخر سمجھتے تھے۔ بعض اوقات ایسی بات کہہ جاتے کہ سننے والا تڑپ کر رہ جاتا۔ گھر میں ایک حاکم محسوس ہوتے۔[۶]

ان کے قریبی شاگردِ عزیز ڈاکٹر انوار احمد نے ان کے سوانحی خاکے میں ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ”میں نے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء کے برسوں میں ان کے ساتھ متواتر رہ کر مشاہدہ کیا کہ وہ کرسیوں سے محبت کرنے والے بااختیار لوگوں کی طرح خوشامد نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی اتھارٹی سے خوف زدہ ہوتے تھے۔ انھیں بلوچ ان کی حق گوئی بل کہ تلخ نوائی کے سبب پسند کرتے تھے۔ بہت سے بلوچ طالب علموں کو میں نے خود یہ کہتے سنا، ’خلیل صدیقی بلوچ‘۔ وہ خود بھی ان سے والہانہ پیار کرتے تھے۔“[۷]

نیز یہ کہ نواب بگٹی جب وزیر اعلیٰ بنے تو انھیں اپنا مشیرِ تعلیم مقرر کیا۔ خلیل صدیقی نے اس شرط پر قبول کیا کہ وہ مراعات (گاڑی، بنگلہ، دفتر، فون یا تنخواہ) نہیں لیں گے۔ مارشل لا کے زمانے میں ان پر بدعنوانی کا مقدمہ ہوا، انھوں نے خود اپنا مقدمہ لڑا اور جیت گئے۔ ڈائریکٹر تعلیمات ہوتے ہوئے ان کا اپنا بیٹا میٹرک میں فیل ہو گیا، مگر کسی قسم کی سفارش کرنا گوارا نہ کیا۔

اپنے پیشے سے متعلق ان کا کہنا تھا:

> جنھیں صاحبی عزیز ہے وہ استاد کیوں بنیں۔ استاد تو تیاگی ہوتا ہے۔ بھئی کوئی چاہے کہ گریڈ بھی ملے، ترقیاں اور کرسیاں بھی اور ساتھ معاشرے کی طرف سے حقیقی عزت بھی تو اپنے آپ سے سوال کرو کہ اس کے لیے تم نے کیا تیاگا ہے بھئی۔[۸]

وفات

پروفیسر خلیل صدیقی صاحب کا ۱۱ مارچ ۱۹۹۶ء کی شام سات بجے انتقال ہوا۔ ان کا جگر سکڑ گیا تھا اور اپنڈکس بھی پھٹ گیا تھا۔ علاج کے لیے کراچی لے جائے گئے، وہیں تدفین ہوئی۔[۹]

حالاں کی خلیل صدیقی صاحب کی شدید خواہش تھی کہ وہ کوئٹہ میں ہی موفون ہوں۔ بوجوہ ان کی یہ خواہش تو پوری نہ ہو سکی البتہ ان کے مرقد پہ آج بھی "پروفیسر خلیل صدیقی، کوئٹہ والے" درج ہے۔

اُردو لسانیات، پروفیسر خلیل صدیقی سے قبل و معاصر

گیان چند جین کے بہ قول "اردو میں لسانیات کی ابتدا ڈاکٹر زورؔ (ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ) کی کتاب 'ہندوستانی لسانیات' سے ہوتی ہے۔"[۱۰]

ڈاکٹر محی الدین زورؔ کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۲ء میں شمس السلام پریس حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں ان کی ایک اور اہم کتاب ہندوستانی صوتیات بھی شائع ہوئی۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں اردو کو ہندوستانی بھی کہا جاتا تھا۔ سن ۱۹۶۱ء میں مولوی عبدالحق کی قدیم اردو انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

جن چند معروف ماہرینِ لسانیات نے اس ضمن میں خصوصی کام کیا، اور ان کا کام کتابی صورت میں ان دہائیوں میں سامنے آیا، ان کا تذکرہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

ڈاکٹر شوکت سبزواری

شوکت سبزواری کی ۱۹۶۰ء سے ۸۰ء کی دہائی کے دوران لسانیات کے حوالے سے چار اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ سب سے پہلے داستان زبانِ اردو ۱۹۶۰ء میں، لسانی مسائل ۱۹۶۲ء میں، اردو لسانیات ۱۹۷۵ء میں اور اردو قواعد ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئیں۔

گیان چند جین

گیان چند کی اردو لسانیات پر دو اہم کتابیں لسانی مطالعے اور عام لسانیات بالترتیب ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئیں۔ دونوں کتابیں پہلی بار ترقی اردو بورڈ نیو دہلی سے شائع ہوئیں۔

رشید حسن خاں

رشید حسن خاں نے اردو عبارت اور انشا سے متعلق وقیع کام کیا ہے۔ سن ستر اور نوے کی دہائی کے دوران کی چار، پانچ اہم کتابیں اس ضمن میں شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب اردو املا ۱۹۷۴ء میں، دوسری کتاب اردو کیسے لکھیں؟ ۱۹۷۵ء میں، تیسری کتاب زبان اور قواعد ۱۹۷۶ء میں اور چوتھی کتاب انشا اور تلفظ ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ جب کہ بعدازاں عبارت کیسے لکھیں بھی شائع ہوئی۔

علاوہ ازیں بعد دیگر ماہرین لسانیات کی بھی کچھ اہم کتابیں ان دہائیوں میں سامنے آئیں۔ ان میں ۱۹۷۱ء میں تین اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں سہیل بخاری کی اردو کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ، ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین کی جدید اردو لسانیات اور ابواللیث صدیقی کا جامع القواعد کا لکھا ہوا 'حصہ صرف' شامل ہیں۔ بعدازاں ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی کی لسانیات اور اُردو ۱۹۷۲ء میں، پروفیسر عتیق صدیقی کی توضیحی لسانیات ۱۹۷۴ء میں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اردو املا اور رسم الخط ۱۹۷۷ء میں، ڈاکٹر اقتدار حسین خان کی لسانیات کے بنیادی اصول ۱۹۸۵ء میں، اسی سال مرزا خلیل احمد بیگ کی اردو کی لسانی تشکیل، پروفیسر مسعود حسین خاں کی اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ ۱۹۸۶ء میں اور نصیر احمد خان کی اردو لسانیات ۱۹۹۰ء میں سامنے آئیں۔

اردو لسانیات کے سلسلے میں یہ وہ بنیادی کام تھا، جو پروفیسر خلیل صدیقی سے قبل یا ان کے عہد میں ہو رہا تھا۔ یہ کام اپنی جگہ نہایت اہم اور وقیع تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ماہرینِ لسانیات کے سامنے

ایسا کوئی ڈھانچا یا وسیع علمی کام اس سلسلے میں موجود نہ تھا، جس سے رہنمائی لی جا سکتی۔ بالخصوص ایک ایسے عہد میں جب ذرائع ابلاغ نہایت محدود اور علمی کتب تک رسائی جوئے شیر لانے جیسا تھا، اس مشکل موضوع پر کوئی بھی کتاب تصنیف کرنا ایک ایسا کارِ دارد تھا جس میں ہاتھ ڈالنا ادبی جرأت کا تقاضا کرتا تھا۔ یہ جرأت جن لوگوں نے بھی کی، وہ اردو لسانیات کے وہ اولین محسن ہیں جنھوں نے وہ خشتِ اول رکھ دی، جس پہ بعد میں آنے والوں نے ایک شان دار عمارت کھڑی کی۔

پروفیسر خلیل صدیقی کی لسانی خدمات

پس منظر

اردو لسانیات مقداری لحاظ سے غریب مگر معیاری لحاظ سے قابلِ فخر رہی ہے۔ مقداری لحاظ سے نہایت کم کتابیں اردو لسانیات کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ آج بھی ایسی کتابوں کی تعداد چند درجن سے زیادہ نہیں۔ مگر معیاری لحاظ سے دیکھیں تو یہ حصہ مختصر ہونے کے باوجود قابلِ فخر نظر آتا ہے۔ جن چند نام وَر اصحاب نے اردو لسانیات کو موضوعِ سخن بنایا، پروفیسر خلیل صدیقی ان میں نمایاں ترین ہیں۔ ہندوستان سے مہاجرت کے بعد بلوچستان کی سنگلاخ سرزمین سے ان کے علمی و فکری سرچشمے پھوٹے جنھوں نے پورے خطے کو اپنے نور سے سیراب کیا۔

خلیل صدیقی کی یکے بعد دیگر سامنے آنے والی تصانیف اردو لسانیات میں گراں بہا اضافہ ہیں۔ جنھیں وہ نہایت حلم، عاجزی اور انکساری کے ساتھ تصنیف کی بجائے تالیف قرار دیتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی کل پانچ کتابیں بیس، پچیس برس کے عرصے میں وقفے وقفے سے سامنے آئیں۔ ان کا سوانحی خاکہ مرتب کرنے والے ان کے قریبی شاگرد ڈاکٹر نعمت الحق ان کی تفصیل اور سنِ تصنیف و اشاعت کچھ یوں بتاتے ہیں:

> زبان کا مطالعہ اور زبان کا ارتقا کے بعد خلیل صدیقی 'لسانی مباحث' ۱۹۷۹ء میں مکمل کر چکے تھے۔ لیکن اس کتاب کے شائع ہونے میں بوجوہ تاخیر ہوئی جس کا ذکر انھوں نے اس کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ اس کے مسودے میں ترمیم و اضافے کے بعد 'لسانی مباحث' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ اسی کی دہائی میں انھوں نے 'زبان کیا ہے' پر کام شروع کیا۔ اس کتاب میں لسانیات عام (جنرل لنگوئسٹکس) کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی

ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے صوتیات کی مبادیات پر ایک مختصر کتاب تحریر کی جو 'آواز شناسی' کے عنوان سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ اطلاقی لسانیات اور اطلاقی صوتیات پر خلیل صدیقی دو کتابیں تحریر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

لیکن غالب امکان یہ ہے کہ آواز شناسی، لسانی مباحث سے قبل شائع ہوئی۔ اس کی گواہی ہمیں خود مصنف کے الفاظ میں آواز شناسی کے دوسرے باب میں ملتی ہے۔ 'فونیمیات' کے باب میں خلیل صدیقی ابتدائی نوٹ میں لکھتے ہیں:

ذیل کے مباحث مؤلف کی ایک کتاب 'لسانی مباحث' کے ایک باب کی تلخیص ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں ٹائپ میں چھپنی شروع ہوئی تھی، لیکن طباعت روک دی گئی اور کتاب ہنوز شرمندۂ طباعت نہیں ہو سکی۔[۱۲]

اس کی مزید تصدیق لسانی مباحث کے ۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والے ایڈیشن سے ہوتی ہے، جس کے بیک فلیپ پر 'مصنف کی دوسری کتابیں' کے زیر عنوان فہرست میں آواز شناسی کا نام بھی درج ہے۔[۱۳] یعنی یہ کتاب ۱۹۹۰ء سے قبل شائع ہوئی ہے۔ لیکن پبلشر نے اس کی تازہ اشاعت میں اولین اشاعت کا تذکرہ نہیں کیا۔

پروفیسر خلیل صدیقی نے لسانیات پر پانچ کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں اس موضوع کے حوالے سے نہایت اہم اور بنیادی تصانیف سمجھی جاتی ہیں۔ بالخصوص اُردو میں لسانیات کے موضوع پر اُس زمانے میں کتابیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ان کی کتابوں کے نام بالترتیب یوں ہیں:

۱) زبان کا مطالعہ ۲) زبان کا ارتقا ۳) زبان کیا ہے؟ ۴) آواز شناسی ۵) لسانی مباحث

۱۔ زبان کا مطالعہ

پروفیسر خلیل صدیقی کی یہ باضابطہ کتاب خود ان کے ناشر کے بہ قول پہلی بار ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ جس کی تعداد گیارہ سو تھی۔[۱۴] نیز ناشر ہی کے بہ قول اس کا اولین منفرد ٹائٹل جناب حنیف رامے نے بنایا تھا۔ کتاب کی دوسری اشاعت اکتوبر ۲۰۰۱ء میں عمل میں آئی۔

واضح رہے کہ اس زمانے میں اردو لسانیات پر کتابیں خال خال ہی دست یاب تھیں۔ زیادہ تر انگریزی کتابوں کے تراجم تھے۔ طبع زاد تصانیف کا رجحان ابھی نہیں پڑا تھا۔ نہایت وقیع، گہرا اور خشک موضوع

ہونے کے باعث اردو کے ماہرین نے ابھی تک اس میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کی تھی بل کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُس وقت تک اردو میں ماہرینِ لسانیات ہی خال خال موجود تھے۔

اس کا اظہار خود پروفیسر خلیل صدیقی نے اپنے مختصر دیباچے میں کچھ ان الفاظ میں کیا:

> اردو میں لسانیات کی عمر بہت کم ہے۔ اس مختصر سی مدت میں بھی لسانیات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے بعض علمائے لسانیات کی ژرف نگاہی اور تحقیق وتدوین بڑی وقیع ہیں لیکن ان سے اردو کی کم مائیگی کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں مبادیاتِ لسانیات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔[۱۵]

سو، بالآخر انھوں نے خود اس موضوع پر قلم اٹھا کر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ عرضِ ناشر، اور مصنف کے مختصر دیباچے کے علاوہ مرکزی موضوع سے متعلق یہ کتاب چار ابواب میں تقسیم ہے۔ اس کے علاوہ آخر میں حواشی، کتابیات اور اشاریہ کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

یہ چار مرکزی ابواب کچھ یوں ہیں:

۱) لسانیات کیا ہے؟ ۲) تاریخی جائزہ ۳) شاخیں اور شعبے ۴) لسانیات اور دوسرے علوم

کتابیات میں درج حوالے مصنف کے وسیع المطالعہ ہونے کی دلالت کرتے ہیں۔ ۲۳۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مصنف کے علم اور اعلیٰ فکری بصیرت کا بھرپور نمونہ ہے۔ مگر ان کا حلم ملاحظہ ہو کہ وہ اسے باضابطہ تصنیف کی بجائے محض مغربی مصنفین سے استفادۂ علم قرار دیتے ہیں۔ اپنے مختصر دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ''زیر نظر تالیف، اردو لسانیات کے متذکرہ خلا کو پُر کرنے کی ایک حقیر سی کوشش ہے جسے مغرب کے بعض علمائے لسانیات اسے استفادہ کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر مبادیاتِ لسانیات کا یہ جائزہ لسانیاتی نقطہ نظر کو فروغ دینے میں مدومعاون ہو سکے تو اس کے منظر عام پر آنے کی غرض و غایت پوری ہو جائے گی۔ مؤلف کی علمی بے بضاعی کی وجہ سے بعض فروگزاشتیں بھی نظر آسکتی ہیں، ان کی تلافی اصلاحی مشوروں سے ہی ہو سکتی ہے۔''[۱۶]

۲۔ زبان کا ارتقا

خلیل صدیقی کی لسانیات پر یہ دوسری تصنیف ہے۔ جس کی پہلی اشاعت ۱۹۷۷ء اور دوسری ۲۰۰۰ء میں عمل میں آئی۔ زمرد پبلی کیشنز اس کے ناشر اور قلات پریس پرنٹر تھے۔ مختصر دیباچہ اور

پُر مغز تمہید کے بعد یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم ہے۔ ان کی ترتیب کچھ یوں ہے:

۱) آغازِ زبان کے مسائل ۲) نظریے ۳) صوتی ابلاغ: مختلف صورتوں میں ان کا ارتقا
۴) لسانی ارتقا کے مدارج ۵) دلالت کی اکائیاں (لسانی ارتقا میں ان کا کردار)
۶) لسانی تغیرات اور ان کے اسباب ۷) ترقی یا لسانی انحطاط

سولہ صفحات پر مشتمل تمہید میں وہ زبان کے ارتقائی مباحث پر گفت گو کرتے ہوئے اس کے آغاز تک پہنچتے ہیں اور بعض استفہامیوں کی صورت میں گفت گو کا خاتمہ اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی توجہ آگے کی گفت گو پر برقرار رہے اور یہ ساتھ جُڑا رہے، نیز قاری کی عمومی دلچسپی کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ جیسے کہ ان استفہامیوں کو گفت گو کی بنیاد بناتے ہوئے وہ تمہید کا اختتام ان فقروں کے ساتھ کرتے ہیں:

"..... صوتی ابلاغ نے نمو کی کیا کیا صورتیں اختیار کی ہوں گی، یہ اور اس طرح کے مباحث کا تعلق آغازِ زبان کے مسائل سے ہے۔"

کل ۲۰۶ صفحات کی کتاب کے آخر میں استفادی کتب کی فہرست منسلک کی گئی ہے۔

۳۔ زبان کیا ہے؟

خلیل صدیقی کی یہ تیسری تصنیف، لسانیات پر ان کا سب سے ضخیم اور وقیع کام ہے۔ یہ ان کی پہلی کتاب ہے جو کوئٹہ سے باہر، ملتان سے شائع ہوئی۔ نیز یہ پہلی کتاب ہے جس میں انتساب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کتاب کا انتساب انھوں نے ملتان کے معروف محقق 'اپنے پیارے دوست ابنِ حنیف' کے نام کیا ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء، جب کہ تازہ ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں چھپا ہے۔ اس دوران کتنے ایڈیشن آئے، پبلشر اس کی کوئی تفصیل نہیں بتاتے۔ حتیٰ کہ پہلی اشاعت کا سن بھی درج نہیں۔ نیز یہ ۲۰۱۴ء کا جدید ایڈیشن بھی کمپیوٹر کمپوزنگ کی بجائے پرانے طرز کی کتابت میں شائع ہوا ہے، جو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ پبلشر کی غیر دلچسپی کی حد یہ ہے کہ آخری پندرہ صفحات قدیم طرزِ کتابت میں نہیں مل سکے تو کمپوز کروا لیے، لیکن یہ نہ ہو سکا کہ پوری کتاب ہی کمپیوٹر پہ کمپوز کروالی جائے۔ کتاب کے پبلشر، بیکن بکس، ملتان ہیں۔

کتاب "اپنی بات" نامی مصنف کے پیش لفظ کے علاوہ پچیس چھوٹے موٹے ابواب میں تقسیم ہے۔ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مصنف کے بہ قول ان کے لیکچرز پر مشتمل ہے، جو انھوں نے بہاءُالدین زکریا یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں جزوقتی طور پر دیے۔ ان کے بہ قول یہ تین جلدوں پر مشتمل منصوبہ تھا۔

زبان کیا ہے ؟اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔

۴۔آواز شناسی

یہ خلیل صدیقی کی لسانیات سے متعلق نسبتاً مختصر کتاب ہے۔ جس میں صوتیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ان کی دوسری تصنیف ہے جو بیکن بکس ملتان سے شائع ہوئی۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۹۰ء کے آس پاس عمل میں آئی۔ پبلشر نے پہلی اشاعت کا سن درج نہیں کیا۔ البتہ پیش لفظ میں دسمبر ۱۹۸۸ء درج ہے۔ ہم اسی سے اس کے سنِ اشاعت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ آخری اشاعت ۲۰۰۹ء میں ہوئی۔ اس دوران ہونے والی اشاعتوں سے متعلق پبلشر خاموش ہے۔ نیز تازہ ترین اشاعت بھی قدیم طرزِ کتابت میں ہی ہوئی ہے۔ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل کتاب میں پیش لفظ کے علاوہ تمہید سمیت چار ابواب شامل ہیں۔ آخر میں فرہنگِ اصطلاحات بھی شامل کی گئی ہے، جس میں اردو اصطلاحات کے انگریزی مفاہیم درج کیے گئے ہیں، جن سے ان کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے اور زبان و ادب کے ایک عام طالب علم کے لیے ان اصطلاحات کے پس منظر میں متن کی تفہیم میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

دس صفحات پر مشتمل تمہید موضوع کا تعارف پیش کرتی ہے۔ جس میں صوتیات کے مختلف نظریات، مغربی ماہرین کی آرا کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ تعارف ایک لحاظ سے مرکزی موضوع کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

۵۔لسانی مباحث

یہ ایک اور ضخیم کتاب ہے، جو ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آئی۔ زمرد پبلی کیشن سے یہ خلیل صدیقی کی تیسری کتاب تھی۔ نیز ان کی زندگی میں شائع ہونے والی آخری کتاب۔ لگ بھگ چار سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں خلیل صدیقی کے لسانیات پر مختلف مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ اس لیے وہ خود اسے کوئی باضابطہ تصنیف نہیں کہتے۔ اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنے دوست اور پبلشر زمرد حسین کے نام کیا، جو ان کی اولین کتابوں کا محرک بھی تھے۔ انھی کی تحریک پر اس کتاب پر کام شروع ہوا، جو ان کی ناگہانی وفات کے باعث تاخیر کا شکار ہوا۔ قریباً بارہ برس کی کاوشوں کے بعد ان کی یہ تصنیف منظر عام پر آئی۔ اس تاخیر کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس دوران کئی مضامین کا اضافہ بھی ہوتا رہا۔ جس کے نتیجے میں کتاب کی ضخامت اور قدر و قیمت دونوں میں گراں بہا اضافہ ہوا۔

گو کہ صدیقی صاحب اپنی اس تصنیف کو لسانیات کے موضوع پر باضابطہ کتاب نہیں سمجھتے، بل کہ وہ انھیں مختلف مضامین کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے قطع نظر، دلچسپ امر یہ ہے کہ یہی ان کی واحد کتاب ہے جنھیں معروف معنوں میں ان کی 'تصنیف و تخلیق' قرار دیا جا سکتا ہے۔ جستہ جستہ لکھے گئے یہ مضامین علمِ لسانیات کی مختلف شاخوں کو موضوع بناتے ہیں۔ نیز باضابطہ کتاب کا حصہ نہ ہونے کے باعث ان کی زبان بھی عمومی لسانیاتی اصطلاحات سے پاک اور آسان فہم ہے۔ جو زبان و ادب کے عام قاری کے لیے بھی مفید ہے۔

پروفیسر خلیل صدیقی کا اختصاص

- خلیل صدیقی صاحب نے ایک ویسے وقت میں اردو لسانیات کے مشکل و پیچیدہ موضوع پہ ہاتھ ڈالا جب اس موضوع پہ لکھنے والے خال خال ہی تھے۔ ان میں سے بھی اکثر لکھنے والوں کا مطالعہ ہندوستانی زبانوں تک ہی محدود تھا۔ جب کہ خلیل صدیقی صاحب مغربی ماہرینِ لسانیات کے افکار سے بھی کم حقہ آگاہ تھے۔ اس لیے پہلی بار اردو لسانیات کو ایسا ذخیرہ میسر آیا جس میں جدید مغربی حوالے بھی شامل تھے اور اردو لسانیات کی ضروریات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔
- پہلی کتاب زبان کا مطالعہ میں ہرڈر سے لے کر جینش، انیسویں صدی کے مفکرین میں بلوم فیلڈ، فریڈرک فان شلیگل، ریسمز ریسک، فرانز بوپ، جیکب گرم، ولہم فان ہمبولٹ، آگسٹ فریڈرک پاٹ، کے ایم راپ، جے ایچ برلیس ڈروف، جارج کرٹی اَس، آگسٹ شیلخر، آگسٹ فِک، جان نکولائی میڈوگ، میکس ملر، ولیم ڈوائٹ وھٹنے، نیز جدید ماہرینِ لسانیات میں سے جسپر سن، ولیم تھامس، کارل بروگ مین و دیگر کے افکار و نظریات کا تذکرہ شامل ہے۔
- دوسری کتاب زبان کا ارتقا میں لسانیات کے ان گوشوں کو چھیڑا گیا ہے، جنھیں اُردو لسانیات میں اس سے قبل موضوعِ تحریر نہیں بنایا گیا۔ دیباچے میں خود انھوں نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''اردو دنیا میں تو لسانیات کی عمر بہت ہی کم ہے۔ اور اس کی جانب توجہ مبذول کرنے والے معدودے چند افراد ہی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بھی اردو کی لسانی تاریخ یا تقابلی مطالعے کے دائرے سے باہر نکلنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ جدید لسانیات اور اس کی ترقی یافتہ تکنیک سے استفادہ کرنے کے لیے لسانیات کی

مصطلحات اور مبادیات سے واقفیت اشد ضروری ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے ماہرینِ لسانیات نے مصطلحات اور مبادیات کی توضیع کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔"[۱۷]

- تیسری کتاب میں پھر انھوں نے عالمی سطح پر ہونے والے لسانی مباحث کو موضوع بنایا۔ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مصنف کے بہ قول ان کے ان لیکچرز پر مشتمل ہے، جو انھوں نے بہاءُالدین زکریا یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں جزوقتی طور پر دیے۔ ان کے بہ قول یہ تین جلدوں پر مشتمل منصوبہ تھا۔ زبان کیا ہے ؟ اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ مصنف کے بہ قول، زبان سے متعلق کیا، کیوں اور کیسے کے علمی اور مدلل جوابات ہی میں زبان کی ماہیئت، اہمیت مناصب و وظائف کی نوعیتیں مضمر ہیں اور انھی سے زبان شناسی کی حدود کا تعین اور اس کی وسعت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔[۱۸]
- اپنی دیگر تصنیفات کی طرح وہ اس کتاب کو تصنیف کی بجائے تالیف قرار دیتے ہیں اور اپنے سارے کام کو مغربی مصنفین کے علم و فن سے استفادے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں "زبان کیا ہے ؟ تصنیف نہیں، تالیف ہے۔ مختلف علمائے لسانیات اور دانش وروں سے استفادے کا ماحصل۔ اردو کا دامن اس کے پیش کردہ مباحث سے خالی تو نہیں لیکن یہ سرسری، اجمالی اور بکھرے ہوئے ہی ہیں۔ لسانیاتی تشنگی بجھانے سے قاصر۔ شاید انھیں زیادہ درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس لیے اردو لسانیات بسم اللہ ہی کے گنبد میں ہے۔ جستہ جستہ اکھڑے مضامین سے اردو لسانیات کی کوئی باقاعدہ روایت تو قائم نہیں ہو سکتی اور نہ بنیادی مطالعاتی مواد کی کمی کی تلافی ہو سکتی ہے۔ زیر نظر کتاب کے مباحث مغربی دنیا کے لیے تو خاصے پیش پا افتادہ ہیں لیکن ہمارے عام قارئین کے لیے نہیں۔ ان میں جامعیت نہیں ہے، تاہم جو کچھ بھی تفاصیل ہیں اور اردو لسانیات کے خلا کو کسی قدر پُر کر سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان سے بعض مبتدیوں کو لسانیاتی نقطہ نظر پیدا کرنے میں تھوڑی بہت مدد مل سکے اور نصابی ضرورت بھی پوری ہو سکے۔"[۱۹]
- آواز شناسی اردو میں پہلی مستقل کتاب ہے، جس میں صوتیات کی تمام جولان گاہوں، گوشوں اور پہلوؤں کا پورا حق ادا ہوا ہے۔ اسی کتاب میں فونیم، فونیمیات، ساختیات کے مباحث بھی ہیں۔ کیوں کہ فونیمیات، صوتیات کی اطلاقی سائنس ہے۔ فونیم کے تصور، تاریخ، نظریوں، فونیم کی پہچان، تفاعل،

سلیبل کی ساخت لسانی ساخت کے عمل، فونیمی تجربے پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور کتاب آواز شناسی کا فریضہ ادا کرتی ہے۔[۲۰]

- آخری کتاب لسانی مباحث مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، تمام مضامین علمِ لسانیات ہی سے متعلق ہیں۔ صرف پہلا مضمون 'لسانیات کیا ہے؟' ساٹھ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مضمون ان کے کتابی منصوبے کا حصہ تھا۔ اس لیے اس میں لسانیات کے علمی پس منظر کو خاصی وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائی چند مضامین میں ایک خاص ربط غیر محسوس انداز میں قاری کے ساتھ رہتا ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کا آخری مضمون 'پاکستان اور لسانی مسائل' نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں پاکستان کے تناظر میں لسانیات کے مسائل و معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے، مذکورہ مسائل کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون کا اختتامی تجزیہ، صدیقی صاحب کے فہم و دانش، تدبر اور ان کے اُس موقف کی دلالت کرتا ہے، جس کا پرچار وہ تاحیات کرتے رہے۔ زبانوں کی ترویج کے ضمن میں اُس وقت کا ترقی پسند موقف یہی ہو سکتا ہے، جو صدیقی صاحب نے پیش کیا۔ پاکستان میں لسانیات کے مسائل پر گفت گو کو وہ ان سطروں کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

> پاکستانی زبانیں علاقائی اور ذیلی تہذیبوں کی شناخت کی علامتیں ہیں اور قومی زبان قومی تشخص کی، اور سالمیت کی ضرورت بھی ہے۔ ان سب کے فروغ اور مناسب اور جائز نفاذ کے مناہج متصادم نہیں ہونے چاہئیں۔[۲۱]

افسوس کہ اسی موقف کا استرداد آج تک پاکستان میں قومیتوں کے مابین چپقلشوں کا سبب بنا ہوا ہے۔

حاصلِ کلام

ادب ہو یا زندگی کا کوئی بھی شعبہ، ہم دیکھتے ہیں کہ اب کسی ایک فن پہ دسترس حاصل کرنے کا رجحان 'ہر فن مولا' کی ہیجانی کیفیت میں بدلتا جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ 'نہ تین میں نہ تیرہ میں' کی صورت برآمد ہوتا ہے۔ خلیل صدیقی ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی ذات کا جوہر پہچان لیتے ہیں اور پھر اس سے باہر نکلنے کی بجائے اس کی تراش خراش میں لگ جاتے ہیں، یوں ایک گوہر نایاب تخلیق پاتا ہے۔

خلیل صدیقی نے تمام تر علم و فن کے باوجود معلّمی کا پیشہ چنا، پھر شعر و ادب پہ ہر ممکن دسترس کے باوجود تحریری اظہار کے لیے لسانیات کا موضوع منتخب کیا اور اسی دشت کی سیاحی میں عمر صرف کر دی۔ جس

کے نتیجے میں پانچ ایسی لازوال تصانیف ادب کے قارئین کو عطا کیں، جن کا چشمے سے آج تک سیکڑوں تشنگانِ علم سیراب ہوتے چلے آرہے ہیں۔

لسانیات محض خلیل صدیقی کا تحریری موضوع نہ تھا بل کہ اسے انھوں نے اپنی عملی زندگی میں بھی اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ جس کی تصدیق ان کے اہلِ خانہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ان کی اہلیہ کے بہ قول وہ ''زبان کی صحت کا خاص خیال رکھتے۔ عام بول چال میں ایک زبان کی دوسری زبان میں آمیزش بالکل پسند نہ تھی۔ لیکن ساتھ ہی بچوں کو مقامی زبانیں سیکھنے کی تلقین کرتے تھے۔''[۲۲] یہی بات بیٹی، حمیرا خلیل صدیقی کچھ یوں بتاتی ہیں:

> غلط تلفظ ابا سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ اطہر توتلا بولتا تھا، اکثر بہت سے لفظ الٹے بول جاتا اور ابا بارات کو اٹھا اٹھا کر تلفظ درست کرواتے۔[۲۳]

گویا زبان دانی و زبان شناسی ان کے روزمرہ معمول کا حصہ تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم ان کی پانچ زندہ جاوید تصانیف سے کیوں کر آشنا ہوتے۔

پروفیسر خلیل صدیقی کے شاگردِ عزیز نعمت الحق کے بہ قول ''وہ اطلاقی لسانیات اور اطلاقی صوتیات پر دو مزید کتابیں تحریر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔''[۲۴] جب کہ ان کی زندگی میں شائع ہونے والی آخری تصنیف لسانی مباحث کے بیرونی فلیپ کور کی پشت پر 'مصنف کی دوسری کتابیں' کے عنوان سے درج سرخی کے ضمن میں 'زیرِ طبع' کے تحت دو کتابوں کا عنوان درج ہے:

۱) اردو ہے جس کا نام ۔۔۔۔۔ ۲) زبان شناسی

نیز 'زیرِ ترتیب' کتب میں دو مزید نام درج ہیں:

۱) کچھ پاکستانی زبانیں ۔۔۔۔۔ ۲) لسانیات کی مختصر تاریخ[۲۵]

افسوس کہ ان کی ناگہانی مرگ کے باعث یہ شاہکار منصہ شہود پر نہ آسکے، کہ ان کے محبوب پبلشر دوست بھی ان سے قبل ہی رحلت فرما چکے تھے۔ انھی کے پُرزور اصرار پر خلیل صدیقی کی تحریریں ہمیں تصنیف کی صورت میں عطا ہوئیں۔ یہ روداد خلیل صدیقی کی اہلیہ نے کچھ یوں بتائی ہے:

> جب مستونگ ٹرانسفر ہوا تو ان کی دوستی وہاں کے ایک علم دوست، سچے اور مخلص انسان سے ہوئی، وہ نیپ کی گورنمنٹ میں تھے۔ ان کا نام زمرد حسین تھا۔ وہ پبلشر بھی تھے۔

> ان کی مسلسل کوشش اور اصرار سے کچھ لکھنے پر مائل ہوئے۔ انھیں بھی ایسی کتابیں چھاپنے کا جنون تھا جس میں مالی منفعت تو نہ تھی البتہ ادیبوں کی قدر دانی کا جذبہ فراوانی سے تھا۔ وہ دور بھی عجیب تھا۔ کبھی ایک صفحہ لکھا اور کبھی دو۔ اس کی کتابت ہو جاتی پھر ان کا تقاضا بڑھ جاتا، پھر ایک دو صفحے گھسیٹ کر دیتے۔ زمرد صاحب بھی بوتل کے جن کی طرح تقاضا کرتے نہ تھکتے اور نہ بیزار ہوتے۔ اگر وہ مسلسل اصرار نہ کرتے تو شروع کی تخلیقات وجود میں نہ آتیں۔[۲۶]

گویا ان تصنیفات کا نیم سہرا ان کے پبلشر دوست کو بھی جاتا ہے۔ وہ حیات ہوتے تو صدیقی صاحب کی مزید تصانیف بھی شرمندۂ تعبیر ہو سکتی تھیں۔ الغرض، جو سرمایہ اب بھی ہمیں میسر ہے، اس سے خاطر خواہ استفادہ لسانیات کے بحر بیکراں سے آشنا کروانے کو کافی ہے۔

ڈاکٹر نعمت الحق نے ان کے مختلف مضامین کو یکجا کر کے دو کتابوں کی صورت میں حال ہی میں شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں اردو کے لسانیاتی مباحث اور لسانیاتی مطالعات کے عنوان سے بکس اینڈ ریڈز ملتان نے ۲۰۲۴ء میں شائع کی ہیں، لیکن ان میں بیش تر مضامین وہی ہیں جو اس سے قبل ان کی مختلف کتابوں میں شامل رہے ہیں۔ نعمت الحق کے بہ قول یہ دراصل ان کے وہ لیکچرز ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ اردو میں دیتے رہے۔

پروفیسر خلیل صدیقی کی لسانی خدمات سے کماحقہ آگاہی کے لیے ان کی تصانیف کا مطالعہ بہتر رہ نما ہو سکتا ہے۔ یہ تصانیف ان کی علمیت کا بین ثبوت ہیں اور اردو لسانیات کے ذخیرے میں ایسا بیش بہا اضافہ ہیں جن پہ اردو زبان کو بالعموم اور بلوچستان کو بالخصوص ہمیشہ فخر رہے گا۔ مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ خلیل صدیقی بلوچستان میں جس لسانی روایت کی بنیاد رکھ گئے تھے، آج اس کا تسلسل معدوم ہوتا نظر آرہا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے وقت میں لسانیات جیسے مشکل موضوع پہ لکھا جب اس پہ بنیادی مواد کا حصول ہی ناممکن سا تھا۔ آج جب کہ کسی بھی موضوع پر تحقیقی کام کرتے ہوئے بنیادی و ثانوی ماخذات کا حصول کچھ ایسا مشکل نہیں رہا، اس جانب توجہ نہ دینا محققین کی سہل انگاری ہی کہلائے گا۔ خلیل صدیقی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے چھوڑے ہوئے ترکے کو اپنایا جائے اور اس میں مزید اضافے کیے جائیں جو اسے بیش بہا بھی بنائیں اور اس روایت کے تسلسل کو بھی قائم رکھیں۔

حوالہ جات

۱۔ سیما صدیقی، ''پروفیسر خلیل صدیقی، سوانحی جائزہ'' مشمولہ: پیکرِ مہروفا، تدوین، نعمت الحق (کوئٹہ: قلات پبلشرز، ۲۰۰۸ء)، ۱۰۔

۲۔ ایضاً، ۱۱۔

۳۔ جلیل صدیقی، ''میرا پیارا بھائی'' مشمولہ: انگارے ۳ (ملتان: مارچ ۲۰۰۳ء)، ۱۷۔

۴۔ سیما صدیقی، ''خلیل صدیقی: سوانحی جائزہ'' مشمولہ: انگارے ۳ (ملتان: مارچ ۲۰۰۳ء)، ۷۔

۵۔ بیگم زبیدہ خلیل صدیقی، ''یادِ ماضی'' مشمولہ: انگارے ۳، ۹۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ انوار احمد، یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء)، ۳۵۔

۸۔ ایضاً، ۳۷۔

۹۔ ایضاً، ۳۸۔

۱۰۔ گیان چند جین، لسانی مطالعے (نیو دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء)، ۸۔

۱۱۔ نعمت الحق، ''جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں'' مشمولہ: پیکر مہر و فا، ۴۵۔

۱۲۔ خلیل صدیقی، آواز شناسی (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۹ء)، ۹۷۔

۱۳۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث (کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، بیک فلیپ۔

۱۴۔ یاسر صدیق، ''عرضِ ناشر'' مشمولہ: زبان کا مطالعہ (کوئٹہ: روبی پبلشرز، س ن)، ۵۔

۱۵۔ خلیل صدیقی، زبان کا مطالعہ (کوئٹہ: روبی پبلشرز، س ن)، ۷۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ خلیل صدیقی، زبان کا ارتقا (کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، اشاعتِ دوم، ۲۰۰۰ء)، ۶۔

۱۸۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۴ء)، ۶۔

۱۹۔ ایضاً، ۷۔

۲۰۔ اصغر علی شاہ، ''آواز شناسی کی تقریظ'' مشمولہ: پیکر مہرو وفا، ۱۸۴۔

۲۱۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث (کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ۳۹۸۔

۲۲۔ بیگم زبیدہ خلیل صدیقی، ''یادِ ماضی'' مشمولہ انگارے ۳، ص ۱۱۔

۲۳۔ حمیرا خلیل صدیقی، ''پیارے ابا'' مشمولہ انگارے ۳، ص ۱۹۔

۲۴۔ نعمت الحق، ''جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں''، مشمولہ پیکر مہر و فا، ۴۵۔

۲۵۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث (کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، فلیپ کور۔

۲۶۔ بیگم زبیدہ خلیل صدیقی، ''یادِ ماضی''، مشمولہ انگارے ۳، ص ۹۔